OPEN ACCESS
Al-SHARQ
ISSN (Print): 2710-2475
ISSN (online): 2710-3692
www.alsharqjr.com

Al-SHARQ
Vol.: 01, Issue: 01, Jan-June 2020, PP: 21 - 37

اسلام اور مغرب: باہمی تفاہم و توافق

Islam and the West: Mutual Understanding and Consensus

Muhammad Umar Farooq
Arabic Teacher, ESED Mansehra

Ahmed Abdullah
Lecturer (TVF), NUST Islamabad

Abstract

This paper discusses the basic concepts of Islam and West. The primary philosophical principles of Islam have always been harmonious to human nature. These principles are flawless due to having a strong base of divine revelation, while the west has dominated the intellection. And due to its imperfection, the laws based on it need to change frequently. Islam develops the human lifestyle upon its own principles as no sphere of life can go inaccessible. It has a particular concept of a successful life that claims specific requisitions and doesn't accept an infusion of any other concept. Islam doesn't arrange substitutes for needless matters rather demands their elimination. These principles have been highlighted in this paper.

Keywords: *Islam, west, basic thoughts, philosophical principles, conflict*

ہمارا وجود میں آنا، اور پھر روز بروز بڑھتے بڑھتے ایک دن اس دار فانی سے کوچ کر جانا، ہر انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور ہر انسان کے ذہن میں یہ سوالات پیدا کرتا ہے کہ میں کون ہوں؟ میرا اس کائنات سے کیا رشتہ ہے؟ مجھے پیدا کرنے والا کون ہے؟ یہ کائنات کا سارا نظام چلانے والا کون ہے؟ الغرض یہ سب سوالات اس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، اور پھر جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جاتا ہے، وہ انکے حل کے لئے جستجو کرنے لگتا ہے، اور پھر عموماً اس کی سوسائٹی میں موجود فکر اس کو اس کے جوابات دینے کی کوشش کرتی ہے، پھر کبھی تو وہ اس میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اس کے لئے مطمئن زندگی کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے، اور کبھی وہ فکر اپنی کمزوریوں کی وجہ سے اس کو مطمئن نہیں کر سکتی اور وہ شخص ایک کشمکش کی زندگی جیتا ہوا بڑا ہوتا ہے۔

تفصیل میں جانے سے پہلے سابقہ تحقیق کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

سابقہ تحقیقی کام کا جائزہ

سابقہ تحقیق کا جائزہ لیتے ہوئے اس حوالے سے دو مقالہ جات کا ذکر کیا جاتا ہے:

اسلام اور مغرب

ڈاکٹر عبد القادر صاحب نے اسلام اور مغرب کے نام سے ڈاکٹر محمود احمد غازی کے افکار کو جمع کیا ہے۔اس مقالے میں

مصنف نے زیادہ تر مغربی افکار کے اثرات اور نتائج و ثمرات سے بحث کی ہے جبکہ مغربی افکار کی بنیادوں کی نشاندہی کے بارے کوئی بحث نہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب مغربی بالادستی اور اس کے اثرات کے تحت لکھتے ہیں:

"اگرچہ مغرب تجارت، معیشت، سیاست اور حربی ایجادات کی بنیاد پر مسلمانوں پر بالادستی قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن اس سے زیادہ خطرناک بات جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے افکار و خیالات بھی اس سے متاثر ہونے شروع ہو گئے۔

اس حوالہ سے ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

"یہ بالادستی شروع میں سیاست، عسکریات، تجارت اور معیشت کے میدان میں تھی اور اتنی زیادہ خطرناک نہیں تھی۔ لیکن بالتدریج اس کا اثر مسلمانوں کی ذہنیت پر، مسلمانوں کے خیالات و افکار پر اور بالآخر تہذیب و تمدن پر پڑنا شروع ہوا اور نتیجہ یہ نکلا کہ دنیائے اسلام کے بیشتر حصے میں تعلیم یافتہ اور بااثر حضرات کی بڑی تعداد نے مغرب کے تصورات، مغرب کے خیالات اور مغرب کے افکار کو ایک طے شدہ اصول اور قابل قبول معیار کے طور پر اپنا لیا۔"

مقالے کے آخر میں بطور نتیجہ کے ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ:

"جدید تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بہت بڑی تعداد از سر نو اسلامی شریعت کی طرف متوجہ ہوئی ہے اور ایک بہت بڑا طبقہ ایسا پیدا ہوا ہے۔ جو جہاں مغرب کو خوب سمجھتا ہے وہاں اسلامی شریعت پر ایمان اور شریعت کے از سر نو نفاذ کے لیے اپنے عزم میں کسی بھی دوسرے پر جوش مخلص مسلمان سے کم نہیں۔ چنانچہ اگر آج ہم اپنے نوجوانوں کو مغرب کی جانب سے درپیش جدید چیلنجز سے کماحقہ آگاہی دیتے ہیں اور انہیں ان چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی کھوئی ہوئی عظمت رفتہ حاصل کر لیں اور اس حوالہ سے ڈاکٹر صاحبؒ کی فکر ہمارے لیے صراط مستقیم کی حیثیت رکھتی ہے۔"[1]

اسلام اور مغرب کے باہمی اختلافات

اسلام اور مغرب کے باہمی اختلافات کے نام سے ڈاکٹر دوست محمد خان نے یہ مقالہ تحریر کیا ہے۔ اس مقالے کا سارا موضوع بحث باہمی اختلافات کو بیان کرنا ہے لیکن مصنف نے بنیادوں کو بیان کرنے سے گریز کیا ہے۔ کہ حقیقت میں مغربی فکر کی بنیادیں کیا ہیں؟ اور وہ کس قدر کھوکھلی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب اختلافات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"مغرب نے اسلام کے ساتھ مخاصمت ثابت کرنے کے لئے بے شمار اسباب و ذرائع بیان کئے۔ مستشرقین کی پہلی کھیپ نے اسلام کو مشکوک و مشتبہ بنانے کے لئے ایک صدی لگائی اور کتب کے انبار لگائے۔ دوسرے مرحلے میں الزامات کے ذریعے تصادم کی راہیں تلاش کر کے جنگیں کروائیں۔ آج ایک دفعہ پھر جدید دنیا میں جدید الزامات کے ساتھ مغرب اسلام کے مقابل کھڑا ہو کر پانی گدلا کرنے کی بھرپور کوشش میں ہے اور بار بار سٹریوٹائپ باتیں کہ اسلام جدیدیت اور جدید تقاضوں کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ عورتوں کے حقوق اور آزادی کے خلاف ہے۔ اسلام اور جمہوریت کے درمیان کوئی مطابقت نہیں، وغیرہ وغیرہ۔"

ان سارے الزامات کے باوجود یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے ہ اسلام تہذیبوں کے تصادم کا نہ قائل ہے اور نہ کوئی ارادہ رکھتا ہے۔اسلام کا ماضی کھلی کتاب کی طرح ہے جس میں اسلام نے دوسری تہذیبوں سے جنگ و تصادم کی جگہ تحمل، برداشت، عفو درگزر اور دعوت واصلاح ہی کو ترجیح دی ہے۔پروفیسر خورشید احمد نے کیا خوب فرمایا ہے:

"تہذیبوں میں مکالمہ، تعاون، مسابقت حتی کہ مثبت مقابلہ سب درست لیکن تہذیبوں میں تصادم، جنگ وجدال، خون خرابہ اور ایک دوسرے کو مغلوب ومحکوم بنانے کے لئے قوت کا استعمال انسانیت کے شرف اور ترقی کا راستہ نہیں ہے۔ مراد ہوف مین نے اس سلسلے میں کمال کی فکر عطا کی ہے "تہذیبوں کے ارتقاء میں کبھی کوئی زیرو پوائنٹ نہیں ہوتا۔ دنیا میں ہر شخص نے کسی دوسرے شخص سے فیض پایا اور ہر شخص نے کسی دوسرے کی کامیابیوں پر اپنی عمارت کھڑی کی ہے"۔"

مقالے کے آخر میں ڈاکٹر صاحب نتیجے کے طور پر لکھتے ہیں:

"مغرب کو چاہئے کہ اپنی کامیابیوں میں دنیا بالخصوص اسلامی دنیا کو شریک کرے اور مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے عمل وفکر کے ذریعے اسلام کی حقانیت اور روحانیت سے پوری دنیا بالخصوص مغرب کی اندر کی تاریکیوں کو روشن کرے تاکہ اس دنیا کو جنت نظیر بن کر آخرت کی راہیں ہموار ہوں۔"[2]

آیئے آج ہم ذرا اسلامی فکر اور مغربی فکر کا مطالعہ کرتے ہیں، پھر باہمی تفاہم و توافق کی صورت میں ان میں تقابل پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

اسلامی فکر:

اسلام اپنا ایک جامع اور ہمہ گیر نظام حیات رکھتا ہے، اس کے اصول وضوابط مستحکم اور باہم مربوط ہیں، اس کا مزاج عدل و انصاف سے مرکب اور معاملات دین ودنیا دونوں کی سرگرمیوں پر پر محیط ہیں۔

اسلامی فکر زندگی کے کسی ایک شعبے سے متعلق نہیں بلکہ یہ ایک نظریہ ہے جو زندگی کے ہر چھوٹے مسئلے سے لیکر بڑے سے بڑے مسئلے کا حل رکھتا ہے۔ اسلام فرد، معاشرہ اور اجتماعیت کو برابر اہمیت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ہر ایک کے لیئے دائرۂ کار، ذمہ داریاں اور حقوق وغیرہ تفصیل سے بیان کرتا ہے۔

اسلامی فکر کی بنیادیں:

مساوات

اسلامی معاشرے میں مساوات کو انتہائی اہم رکن اور سنگ بنیاد ہونے کی حیثیت حاصل ہے، تمام انسان ایک نسل سے ہونے کی وجہ سے اور حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہونے کی وجہ سے برابر ہیں، رنگ، نسل، خاندان اور قبیلہ وغیرہ یہ سب تو فقط ایک دوسرے کی پہچان کے واسطے ہیں، ان چیزوں کو بنیاد بنا کر اختلافات کرنا اور تعصب اور اونچ نیچ پیدا کرنا سراسر غلط ہے۔ وحدت انسانی کی بنیاد پر تمام معاشرتی تعلقات استوار کرنا ضروری ہے۔اللہ تعالی فرماتے ہیں:

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک (ہی) مرد وعورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو کنبوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے تاکہ تم آپس

میں ایک دوسرے کو پہچان سکو، تم سب میں اللہ کے نزدیک باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔"[3]

"اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اسی سے اس کی بیوی کو پیدا کر کے ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلادیں۔اور اس اللہ سے ڈرو جس کے نام پر ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور رشتوں ناتوں کو توڑنے سے بھی بچو۔"[4]

علاوہ ازیں خطبہ حجۃالوداع کے موقع پر بھی آپ علیہ السلام نے انتہائی اہم تعلیمات بیان فرمائیں، من جملہ ان کے یہ بھی فرمایا:

"لوگو! بے شک تمھارا پروردگار ایک ہے، اور بے شک تمھارے والد بھی ایک ہیں، اور ہاں! عربی آدمی کو عجمی پر اور عجمی آدمی کو عربی پر اور سیاہ کو سفید پر اور سفید کو سیاہ پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے ہاں مگر بجز تقوی کے۔"[5]

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

"تمام انسان آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔"[6]

یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کسی رنگ، نسل، زبان، علاقے یا تہذیب وغیرہ کی بنیاد پر تشکیل نہیں پاتا بلکہ اسلامی معاشرہ تو ایک نظریہ کے طور پر وجود میں آتا ہے، اس نظریہ کا مقصد اصلی اللہ رب العزت کی خوشنودی کا حصول ہے، چنانچہ اسلامی معاشرہ رنگ و نسل وغیرہ سے برتر ہو کر اپنے ہر پیرو کو اپنی تمام وفاداریاں خالق کائنات کے ساتھ وابستہ کرنے کا درس دیتا ہے۔اسلام کی بنیاد ان تصورات پر ہوتے ہوئے کہ تمام انسان عزت اور شرافت والے ہیں، اور سب کا سلسلہ ایک ہی ماں باپ پر منتہی ہوتا ہے، اسلئے کسی بھی قسم کی طعن و تشنیع کرنا اور نسلی، لسانی یا علاقائی تعصب کرنا جائز نہیں، اور آپ علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق بزرگی اور برتری اگر کسی کو حاصل ہے تو فقط وہی شخص کہ جس میں تقوی زیادہ ہو۔اور خدا ترسی اور اخلاق کریمہ کا نام ہی تو تقوی ہے۔

خیر خواہانہ فضا

اسلامی معاشرہ ایک دوسرے کی خیر خواہی، باہمی تعاون و امداد اور یک دوسرے کے کام میں مدد کرنے دکھ درد غم مل بانٹنے اور باہم بھلائی اور ایثار کا جذبہ رکھنے سے بھرپور ہوتا ہے، اس معاشرے کا ہر فرد ظاہراً و باطناً ایک دوسرے پر سلامتی بھیجنے والا ہوتا ہے، کیونکہ پیارے حبیب علیہ السلام کا فرمان ہے:

"تم میں سے کوئی شخص بھی اس وقت تک (کامل) مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیئے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیئے پسند کرتا ہے۔"[7]

اسی طرح اسلامی معاشرہ کسی بھی قسم کے ظلم، کنبہ پروری، حسد و کینہ، چغل خوری، غیبت اور بدگمانی، دھوکہ دہی اور ایک دوسرے کو برے ناموں سے پکارنے، بغض رکھنے، بے عزتی اور بے حرمتی کرنے، کسی کی ٹوہ میں لگنے سے بہت پرے ہوتا ہے، وہ جہاں بہت سی اچھی چیزوں کا حکم دیتا ہے وہیں ان سب بری باتوں سے منع بھی کرتا ہے۔ارشاد باری ہے:

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نہ مردوں کی کوئی جماعت دوسرے مردوں کا مذاق اڑائے— ممکن ہے وہ ان سے بہتر ٹھہریں—اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں—کیا عجب وہ ان سے بہتر نکلیں اور نہ اپنوں کو عیب لگاؤ اور نہ

آپس میں ایک دوسرے پر برے القاب چسپاں کرو۔ ایمان کے بعد فسق کا تو نام بھی برا ہے اور جو لوگ توبہ نہ کریں گے تو وہی لوگ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔ اے ایمان والو! بہت بدگمانیوں سے بچو یقین مانو کہ کچھ بدگمانیاں تو گناہ ہیں اور رازوں کو نہ ٹٹولا کرو اور نا ہی کسی کی غیبت کرو، کیا تم میں سے کوئی بھی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے؟ تم کو اس سے گھن آئے گی اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔"[8]

اسی طرح فرمایا:

"جیسے اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ احسان کیا ہے تو تم بھی اچھا سلوک کرو اور ملک میں فساد کے خواہاں نہ بنو، یقین مانو کہ اللہ مفسدوں کو ناپسند رکھتا ہے۔"[9]

الغرض اس سے بھی بڑھ کر ایک دوسری جگہ تو بہت جامع الفاظ میں بیان فرمادیا کہ:

"جو نیکی اور خدا ترسی کے کام ہیں ان میں باہم ایک دوسرے کا تعاون کرو اور جو کام گناہ اور زیادتی کے ہیں ان میں تم کسی سے تعاون نہ کرو"[10]

علاوہ ازیں احادیث مبارکہ میں بھی بہت تاکید وارد ہوئی ہے۔ آپ علیہ السلام کا فرمان ہے:

"مسلمان تو وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ و مامون رہیں اور مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جان اور مال کے سلسلہ میں مطمئن رہیں"۔[11]

مزید فرمایا:

"کہ مومن وہ نہیں جو طعن و تشنیع کرے۔"[12]

ان سب کا خلاصہ بھی ایک حدیث میں بیان فرمادیا:

"کہ دین تو سراسر نصیحت ہی کا نام ہے۔"[13]

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

انسان چونکہ فطرتاً ہی اجتماعیت پسند ہے اور اسی وجہ سے وہ دوسرے افراد کے ساتھ مل جل کر اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا ہے، اور الگ تھلگ رہ کر زندگی گزار نا اسکے لئے انتہائی دشوار بلکہ ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ آج تک انسانی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جب انسان کی اکثریت نے انفرادی زندگی کو اختیار کیا ہو لہذا جب انسان مل کر رہیں گے تو اس سے معاشرہ وجود میں آئے گا، اور پھر جب بہت سے لوگ ہوں گے تو جہاں اچھے کام کرنے والے ہوں گے وہیں پر یقیناً برے کام کرنے والے اور برائی سے متعلق لوگ بھی ہوں گے، چنانچہ ایسے معاشرے میں قیام خیر و دفع شر کے لئے اور معاشرے میں پاکیزگی برقرار رکھنے کے لئے ضرور کچھ لوگوں کو یہ کام سرانجام دینا ہوگا کہ جہاں وہ خود اچھائی کریں گے وہیں دوسروں کو بھی اچھائی اور بھلائی کا حکم کریں اور جہاں خود برائی اور غلط کاموں سے بچیں وہیں دوسروں کو بھی ان برے کاموں سے بچنے کی تلقین کریں، درحقیقت اس امت کو دوسری امتوں پر جو فضیلت دی گئی ہے اسکی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ پچھلی امتوں کو فقط اپنے اعمال پر توجہ دینی تھی جبکہ اس امت نے اپنے اردگرد کے معاشرے کے بارے میں بھی فکر کرنی ہے۔ ارشاد باری ہے:

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے، تم نیک باتوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو"[14]

ایک دوسری جگہ فرمایا:

"تم میں سے کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے "[15]

آپ ﷺ کا ارشاد حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ :

"اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، ضروری ہے کہ تم نیکی کی طرف بلاؤ اور برائی سے منع کرو، ورنہ عین ممکن ہے کہ اللہ اپنی طرف سے تم پر عذاب بھیج دے، کہ پھر تم دعا کرو، مگر تمہاری دعا قبول نہ ہو۔" [16]

الغرض اس سے بھی بڑھ کر ایک دوسری جگہ تو بہت جامع الفاظ میں بیان فرمادیا کہ :

"نیکی اور تقوی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں کسی سے تعاون نہ کرو"[17]

اس آیت مبارکہ میں جو دو لفظ بلکہ جو دو اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں "بر" اور "اثم" یہ اپنے اندر نہایت جامعیت رکھتی ہیں، "بر" میں ہر طرح کی نیکی بھلائی اور خیر خواہی آجاتی ہے جبکہ اثم ہر قسم کے شر، دکھ اور تکلیف وغیرہ کو جامع ہے۔

اللہ رب العزت نے بطور خاص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مؤمنین کی علامت بتلایا ہے، کہ گویا بھلائی کا حکم کرنا اور برائی سے منع کرنا ان کو گھٹی میں پلایا گیا ہوتا ہے۔ ارشاد باری ہے :

"مومن مرد اور مومنہ عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، کہ ایک دوسرے کو بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نماز کو قائم کرتے ہیں، زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں"[18]

اور اسی طرح اللہ رب العزت نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو چھوڑنے والے کو بزبان حکایت سخت وعید بھی اپنے پاک کلام میں سنائی ہے، ارشاد باری ہے :

"منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں، کہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو خیر کے کاموں سے روکے رکھتے ہیں"۔[19]

اور منافق ہونا کوئی معمولی بات نہیں کیونکہ منافقین تو دنیا اور آخرت دونوں میں کفار سے بھی بدتر ہیں، ارشاد باری ہے :

"منافقین تو یقیناً جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں جائیں گے، اور ناممکن ہے کہ تم ان کا کوئی مددگار پالو"۔[20]

انفرادی تشخص کا تحفظ

اسلام جہاں معاشرے کو اہمیت دیتا ہے وہیں پر ہر شخص کو بھی انفرادی طور پر پوری اہمیت دیتا ہے اور اور ہر فرد کو عمارت کی ایک اینٹ قرار دیتا ہے، مغرب کے برعکس جہاں پر فرد کو نظام کے تابع رکھا جاتا ہے اور ہر فرد نظام کا ایک پرزہ بن جاتا ہے۔

اسلام اپنے نظام خلافت پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ معاشرے کے ہر فرد کو خوشحال رکھے وہ تاکہ وہ روحانی و جسمانی دونوں طرح کی ذمہ داریاں مطمئن رہتے ہوئے خوش اسلوبی سے ادا کر سکے چنانچہ اسلام ہر فرد کی جداگانہ شخصیت کا قائل ہوتے ہوئے ہر فرد کو محض اجتماعی نظام کا بے جان اور ناکارہ پرزہ اور ماحول کا پرتو محض نہیں سمجھتا بلکہ یہ فرد کو معاشرے کی انتہائی اہم اکائی اصل

تاریخ ساز قرار دیتا ہے۔

"ہر فرد ہے امّت کے مقدر کا ستارہ"

چنانچہ اسلام ہر فرد میں یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ ہر شخص اپنے کیے کا ذمہ دار اور خدا کے سامنے جواب دہ ہے چنانچہ ارشاد باری ہے:

"جو نیکی کرے گا وہ اپنے ذاتی بھلے کے لئے اور جو برائی کرے گا اس کا وبال اسی پر ہے پھر تم سب اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے"[21]

اسی طرح ہر شخص کو جدوجہد اور سعی کی اہمیت بتلاتے ہوئے اور ہر فرد میں جذبۂ عمل بیدار کرتے ہوئے اس کے ذہن پر یہ نقش کرتا ہے کہ:

"اور یہ کہ ہر انسان کے لئے صرف وہی ہے جس کی کوشش خود اس نے کی"[22]

ارشاد نبوی ہے:

"جو کوشش کرے گا اس کو اس کا بدلہ ملے گا"

اسی طرح ارشاد ہے:

"کوشش کرو اس لئے کہ اللہ نے تم پر کوشش فرض کی ہے"۔

کمزور طبقہ کی مدد

اسلام ایک خوشحال معاشرہ چاہتا ہے جہاں پر ہر شخص معاشی طور پر ایک خوشحال زندگی بسر کر رہا ہو جہاں کوئی بھی غربت کی وجہ سے اپنی جان نہ دے رہا ہو، جہاں امیر غریب پر حاکم نہ ہو بلکہ حاکمیت کا مدار صلاحیت پر ہو، اور ایک متوازن معاشرہ وجود میں آئے۔ اسلام کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ امیر اور غریب کے فرق کو ہی مٹا دیا جائے اور سب پر برابر دولت تقسیم کر دی جائے بلکہ اسلام امیر اور غریب دونوں کو تسلیم کرتا ہے ارشاد باری ہے:

"ہم نے ہی ان کی زندگانی دنیا کی روزی ان میں تقسیم کی ہے اور ایک کو دوسرے سے بلند کیا ہے تاکہ ایک دوسرے کو ماتحت کر لے جسے یہ لوگ سمیٹتے پھرتے ہیں اس سے آپ کے رب کی رحمت بہت ہی بہتر ہے"[23]۔

چنانچہ معاشرے کے افراد کے درمیان توازن اور باہم غمخواری کا احساس بیدار رکھنے کے لیے اسلام مالداروں پر مختلف قسم کی ذمہ داریاں عائد کرتا ہے مثلاً سال بھر میں ایک دفعہ مال کا چالیسواں حصہ اور بڑی عید پر قربانی، چھوٹی عید پر صدقہ فطر وغیرہ اور اس کے علاوہ صدقات نافلہ کی ترغیب دے کر مالداروں کو غریبوں کا دست و بازو بننے کی تلقین کرتا ہے۔

علاوہ ازیں اسلامی معاشرہ میں یتیموں کے حقوق کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا ہے کیوں کہ قرآن وحدیث میں بہت کثرت سے تاکید آئی ہے:

"کیا تو نے دیکھا جو (روز) جزا کو جھٹلاتا ہے، یہی وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے"[24]

مزید یہ بھی بتلایا کہ یتیم کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے سے گناہ بالوں کی مقدار میں جھڑ جاتے ہیں۔ پھر بیواؤں سے

شادی پر ترغیب دی، بوقت ضرورت ان کے کام آنے پر بھی اجر بتلایا، ارشاد ہے جو کسی مسلمان کی ایک حاجت پوری کرے گا اللہ اس کی ستر حاجتیں پوری فرمائیں گے، مسکینوں فقیروں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرنے کا حکم دیا اور وہ اصناف جن کو زکاۃ دی جا سکتی ہے ان میں ان کا شمار فرمایا۔ خلافت راشدہ میں ہمیں یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کی بہترین مثالیں ملتی ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو خاص طور پر ان کے لیے وظائف جاری فرمائے تھے۔

جہاں اسلام نے یتیم کا مال کھانے پر ممانعت اور عذاب وغیرہ بتلایا ہے وہیں یتیم کی اچھی طرح سے پرورش کرنے اس کے مال کا خیال رکھنے اور اس سے بھی بڑھ کر اس کو اچھے کاروبار میں لگانے کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔

"اور تجھ سے یتیموں کے بارے میں بھی سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ ان کی خیر خواہی بہتر ہے، تم اگر ان کا مال اپنے مال میں ملا بھی لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں، بدنیت اور نیک نیت ہر ایک کو اللہ خوب جانتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا یقیناً اللہ تعالیٰ غلبہ والا اور حکمت والا ہے"[25]۔

مغربی فکر:

مغربی فکر کی بنیاد عقلیت، مادیت اور سائنسی ترقی پر ہے۔ انسانی اخلاق اور روحانی اقدار کی ان کی نظر میں کوئی قیمت نہیں بلکہ یہ مادی ترقی اور کسبِ زر کو معراج زندگی سمجھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی میں ہم آہنگی، اعتدال اور توازن قائم نہ رہ سکا۔ گو کہ سائنسی ترقی نے مادی حیثیت سے مغرب کو غیر معمولی طاقت بخشی اور اس کو ظاہری شان و شوکت سے مالا مال کیا لیکن انسانیت کے اصلی جوہر کو نقصان پہنچایا اور انسان کو حقیقی راحت پہنچانے کی بجائے اُس کے لئے پروانہ اجل بن گئی۔

اسلامی دنیا کے برخلاف یورپ کی علمی ترقی یا نَشاۃِ ثانیہ کی بنیاد خدا پرستی کی جگہ مادہ پرستی تھی لہٰذا وہ جلد ہی نری کھری بے روح مادی ترقی میں تبدیل ہوگئی۔ سیاست اور علم و حکمت (سائنس) دونوں سے الوہی دین و مذہب کو الگ کر دینے، اصطلاحی الفاظ میں سیاست اور سائنس کو سیکولر بنا دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں جو نئی مغربی تہذیب وجود میں آئی وہ سامراجی، استعماری، استبدادی و استحصالی تہذیب تھی جو اختیار و اقتدار کے مالک طبقہء اعلیٰ کی غیر معمولی مادی ترقی کی بدولت بہت جلد ''صنعتی تہذیب'' میں تبدیل ہوگئی جس نے وقت کی تمام مذہبی، اخلاقی اور سماجی قدروں کو کمرشیلائز کر کے محض صنعتی، تجارتی اور بازاری اقدار میں بدل کر رکھ دیا جہاں زیادہ سے زیادہ بے قید و بے حساب منافع کا حصول ہی تہذیب کی معراج قرار پایا۔

مغرب میں اخلاقی اور روحانی اقدار سے روگردانی کا سبب سائنس کے انکشافات بنے کہ قدم قدم پر ان کے بنیادی عقائد دینیہ سے ٹکراتے تھے۔ جو بالآخر عقائد کو متزلزل کرتے کرتے مذہب کی روحانی اقدار سے ہی انکار کا سبب بن گئے، مادی اسباب کی فراوانی نے عیش و عشرت اور خود غرضی کو فروغ دیا۔ عورت کو آزادی کے نام پر صنعتی پراڈکٹ کے طور پر بے تحاشا استعمال کیا گیا جو معاشرہ میں فساد برپا ہونے کا سبب بنا۔ روحانی اور اخلاقی اقدار کی غیر موجودگی میں مے نوشی، عریانی، سود خوری اور اخلاقی پستی نے جنم لیا اور ان امراض نے یورپی تہذیب کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا۔

مغربی فکر کی بنیادیں:

اظہار رائے کی آزادی

مغربی فکر اپنے ماننے والوں کو اظہار رائے کی مکمل آزادی دیتی ہے اور ہر شخص کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ جس چیز کے بارے میں چاہے کوئی بھی رائے رکھ سکتا ہے۔ یہ ہر انسان کا ذاتی معاملہ ہے اس پر کسی دوسرے کو تنقید کرنے کی گنجائش نہیں اور ملکی حکومت اور عالمی اداروں کو ہر شخص کا تحفظ یقینی بنانا ہوگا تا کہ ہر شخص اپنے نظریات کے بارے میں خود کو مکمل آزاد سمجھ سکے۔ آزادی اظہار کی اہمیت پر بین الاقوامی انسانی حقوق کے منشور کے آرٹیکل ۱۹ میں کہا گیا ہے:

> "ہر شخص کو اپنی آراء رکھنے کا اختیار ہوگا اور اس سلسلے میں کوئی مداخلت نہیں ہوگی۔ ہر شخص کو آزادیٔ اظہار کا پورا حق حاصل ہوگا۔ اس حق میں ہر طرح کے نظریات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اور معلومات دوسروں تک پہونچانے کی آزادی شامل ہوگی۔ سرحدیں اس حق کی راہ میں حائل نہ ہونگی۔ یہ معلومات تحریری صورت میں، زبانی طور پر، یا کسی آرٹ کی شکل میں یا کسی اور مطلوبہ ذریعہ سے حاصل کی جاسکتی ہیں"[26]

مگر حقوق انسانی کے منشور میں بھی آزادیٔ اظہار کی حدیں متعین کی گئیں اور انسان کو مکمل آزادی نہیں دی گئی۔ آزادیٔ اظہار کی حدود متعین کرتے ہوئے شق نمبر 2 میں کہا گیا ہے کہ آزادیٔ اظہار کے حق کا استعمال کرتے ہوئے کچھ فرائض اور ذمہ داریاں بھی نافذ ہونگی مثلا۔

1۔ دوسروں کی عزت، شہرت اور حقوق متصادم نہ ہوں

2۔ قومی سلامتی، امن عامہ، صحت عامہ، یا اخلاق عامہ متاثر ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

مغرب نے "جدید آزادی" کا نعرہ بلند کیا۔ گویا انسان پر کسی کا اختیار نہیں۔ وہ اپنے ہر کام کی انجام دہی میں پوری طرح آزاد ہے۔ خواہ شراب وشباب کا دلدادہ ہو کر عیش ونوش میں زندگی بسر کردے یا ایک سادہ لوح انسان کی طرح عمر گزار کر مر جائے۔ "مگر اس "آزادی کے جدید تصور" میں بھی جزاو سزا کا معیار مقرر کیا گیا ہے۔ یعنی ایک انسان کو بیک وقت آزادی بھی دی گئی ہے اور پابند بھی رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا ہوتا تو پھر یہ آزاد انسان سماج و معاشرہ کے لئے ناسور بن جاتا اور خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہذا آزادیٔ اظہار کے قانون وضع کئے گئے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ آج کا نظام جو کسی بھی طرح کی مکمل آزادی کی اجازت نہیں دیتا وہ نظام اسلام کے نظام کی حدود و قیود پر تنقید کرتا ہے؟

اگر دنیا کی ہر حکومت اپنے شہریوں کے مفاد میں قانون وضع کرتی ہے اور آزادی کے ساتھ آزادی کے حدود بھی متعین کرتی ہے تو پھر اسلام جو دنیا کی ترقی اور نجات کا عالمی منشور لیکر آیا ہے وہ اپنے قانون کے تحت مکمل آزادی کیسے دے سکتا ہے۔ دنیا کا ہر قانون مشروط ہوتا ہے اور یہ مشروطیت ہی اس قانون کی بقا اور ترقی کی ضمانت ہوتی ہے۔ آزادیٔ اظہار کے سلسلے میں اسلام کے حدود و قیود پر طنزو تشنیع کرنے والوں کو اسلام دشمنی میں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جس نظام کو وہ مثالی نظام کی شکل میں پیش کررہے ہیں وہ بھی حدود و قیود کے بغیر وجود میں نہیں آیا"[27]

ایسے حالات میں یہ کہنا کہ اسلام آزادیٔ اظہار کے خلاف ہے اور اس کا قانون فرد کی آزادی پر قدغن لگاتا ہے؛ خلاف عقل اور

مبنی بر عصبیت ہے۔ جس طرح دنیا کا ہر قانون فرد اور معاشرہ کی آزادی کے لئے قانون وضع کرتا ہے تاکہ امن عامہ برقرار رہے اسی طرح اسلام بھی آزادی کا اپنا تصور پیش کرتا ہے تاکہ معاشرہ فساد سے محفوظ رہے۔

مساوات

مغرب ظاہری طور پر مساوات کا دعوی کرتا ہے لیکن حقیقت میں اس کے تحت مغرب صرف امّت مسلمہ سے ہی مساوات چاہتا ہے۔ خصوصاً اس میں مرد و عورت اور سب مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ یکساں سلوک شامل ہے۔ یہاں پر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ مساوات کی اصطلاح بھی فی نفسہ کوئی متعین معنی نہیں رکھتی۔ دنیا میں دو انسان مساوی ہوتے ہی نہیں چاہے وہ دو جڑواں بھائی ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح یہ لوگ ایک کمپنی کے جنرل منیجر اور ایک چپڑاسی کی تنخواہ میں تفاوت کے جواب میں یا تو مساوات کے ان کے اپنے اصول ہی کے خلاف بات کر رہے ہوتے ہیں یا پھر کوئی استثناء پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ دراصل یہ اصطلاح بھی مغرب کے تسلط کا دوسرا نام ہے۔ اس کی ایک زندہ مثال مسئلہ فلسطین ہے۔

چنانچہ مغرب کا عمل دیکھیئے کہ مغربی ممالک کے ایر پورٹ پر اترنے والے مسافروں سے بھی مختلف طرح کا سلوک کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص مغربی ممالک میں سے کسی ملک کا باشندہ ہو تو اس کے لیئے قومیت کی بنیاد پر الگ قانون ہو گا۔ کہ بسا اوقات بغیر کسی جانچ کے بھی اسے داخلے کی اجازت ہو گی، جبکہ اگر وہ مثلا پاکستانی باشندہ ہے تو اس کو پاکستان سے نکلنے سے پہلے ہی برطانوی سفارت خانے سے اجازت حاصل کرنا ہو گی۔

واضح طور پر یہ تفریق مساوات کے منافی ہے لیکن کوئی بھی اس پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہم نے قومیت کو ایک ایسے نظریے کے طور پر قبول کیا ہوا ہے جس کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان تفریق نہ صرف جائز ہے بلکہ انسانی اجتماعیت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اور یہ نظریہ ہمارے ذہن میں اتنا پختہ ہو چکا کہ اس طرف کسی کا دھیان مشکل ہی سے جا سکتا ہے۔ اب مغرب اور اسلام کا اصل تنازعہ یہ ہے کہ اسلام میں دین ہی انسانوں کے بیچ تفریق کی اصل بنیاد ہے نہ کہ قومیت۔ اگر مغرب ہم سے دینی تفریق کو رد کر کے قومی تفریق کو قبول کرنے مطالبہ کرتا تو یہ ایسے ہے جیسے ہم اس سے عیسائیت کو ترک کر کے اسلام قبول کرنے کا مطالبہ کریں۔ مغرب ہم سے جب یہ کہتا ہے کہ دیکھو ہم نے اپنے ممالک میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھا تو ایک اسلامی نظام میں اس طرح کا مساوات کیوں نہیں ہے۔ ایسے وقت ہمارا ان سے مطالبہ یہ ہو گا کہ آپ اپنے مساوات ثابت کرنے کے لئے تمام قومیتوں کے ساتھ یکساں سلوک کر کے دکھائیں۔ یعنی یہاں پر اصل مسئلہ اسلام اور عیسائیت کا ہے ہی نہیں بلکہ اصل اختلاف یہ ہے کہ انسانوں کی ایک دوسرے سے وابستگی کس بنیاد پر ہو گی؟ قومیت کی بنیاد پر یا عقائد کی بنیاد پر۔ جس طرح مغرب کے لئے قومیت کا فرق ان کے اپنے نظریۂ مساوات کو کالعدم کر دیتا ہے اس طرح ہمارے لئے دین کا فرق اس طرح کے مساوات کے مطالبے پر خط تنسیخ پھیر دیتا ہے۔

اسی طرح جنسی مساوات کے سلسلے میں بھی کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مرد اور عورت میں جسمانی فرق بھی ہوتا ہے اور نفسیاتی فرق بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ یقینی طور پر ان میں معاشرتی فرق بھی ہو گا۔

جمہوریت

موجودہ دور میں جمہوریت سے مراد یہ ہے کہ رائے شماری کے ذریعے سے پارلیمنٹ کے اراکین اور مملکت کے سربراہ کو چنا جاتا ہے،اور قانوناً بھی ان کو عوام کا نمائندہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ پھر وہ جو بھی فیصلے کریں ان فیصلوں کو عوامی فیصلہ قرار دیا جاتا ہے۔اس پورے پراسیس کے بارے میں یہ سمجھااور باور کیا جاتا ہے کہ حکومت وقت جو بھی فیصلہ کر رہی ہے وہ عوام کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے پوری قوم کا فیصلہ ہے۔

یہاں پر ایک الجھن یہ بھی ہے کے یہ پورے کا پورا پراسس کئی دوسرے ایسے نظریات کی مخالفت پر مبنی ہے کہ مغرب جن کا دعوی بڑے زور وشور سے کر رہا ہوتا ہے۔

چنانچہ مثال کے طور پر منتخب عوامی نمائندے ہی اکثریت سے مساوات یادیگر نظریات کے مخالف کوئی قانون پاس کرلیں تو اس کا کوئی حل موجود نہیں۔اس کی واضح مثال جرمنی،فرانس وغیرہ میں پردے پر پابندی ہے۔

یہ بات بھی محل نظر ہے کہ جنہیں ہم عوامی نمائندہ کہہ رہے ہوتے ہیں وہ کیا حقیقت میں بھی عوام کے نمائندے ہوتے بھی ہیں؟ یا یہ ایک فریب ہے جو سب کو دیا جاتا ہے؟۔

کیاایسا شخص جس کے اندر صلاحیت، صداقت اور وطن کی خدمت کرنے کا سچا جذبہ ہو وہ صرف ان خصوصیات کی بنا پر منتخب ہو کر حکومت میں شامل ہو سکتا ہے؟ ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ انتخابات جیتنے اور کامیاب انتخابی مہم کس لیئے بہت زیادہ رقم کی ضرورت ہوتی ہے،اس کے بغیر مقابلے کااور انتخاب جیتنے تصور ہی نہیں۔یہ ایک کھلا ہوافریب ہے۔چنانچہ کئی مغربی ممالک میں بھی اپنی پارٹی کے لیئے انتخابات میں امدادی رقوم کے حصول کے لیئے مجالس کا اہتمام ہوتا ہے۔اور پھر جو ملک کی اشرافیہ اور بڑی کمپنیوں کا منظور نظر ٹھہرے وہی مقدر کا ستارہ کہلاتا ہے۔

حقوق انسانی

انسانوں کو انسان ہونے کی حیثیت سے کچھ بنیادی حقوق دینا بلا شبہ ایک سلیم الفطرت انسان کے لئے الفاظ کی حد تک کافی کشش رکھتا ہے۔ مگر اس وقت انسانی حقوق کے نظریے کو اس طرح پیش کیا جارہا ہے گویا کہ یہ کوئی ہمیشہ رہنے والے اور سب کے یہاں متفقہ حقائق ہوں جن پر سوال اٹھانے کوئی گنجائش ہی نہ ہو۔ 10 دسمبر 1948 کو انسانی حقوق کی ایک قرار داد اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پاس کی گئی جسے Universal Declaration of Human Rights[28] کا نام دیا گیا۔ جو کہ کل 30 آرٹیکل پر مشتمل ہے۔

اس میں بظاہر ہر ایک کے لئے، جنس، قومیت، رنگ، نسل، زبان اور مذہب کے آزادی اور حقوق کی بات ہے۔ان سب کے خلاصہ کو اگر کچھ لفظوں میں بیان کیا جائے تو کچھ نظریات نکل آتے ہیں، جیسے " آزادی، مساوات، جمہوریت، انصاف، حق خود ارادیت، اپنے دفاع کا حق، جائداد رکھنے کا حقوق، تعلیم کا حق وغیرہ"۔ان میں مساوات، آزادی اور جمہوریت کے بارے میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔البتہ ان میں کچھ عجیب قسم کا ٹکراؤ ہے اور وہ یہ کہ ان کی خلاف ورزی اور عدم ادائیگی حقوق کی صورت میں کیا نتیجہ ہوگا؟۔

صرف چند ممالک کو جو کثیر تعداد میں کیمیائی اور نیوکلیائی ہتھیار رکھتے ہیں، بقیہ سب ممالک پر اپنی رائے نافذ کرنے کا اختیار دینا اور دنیا کی ایک بڑی قوم اور حقیقت کو مکمل نظر انداز کرنا ان کے تمام مذموم ارادوں کا پول کھول کر رکھ دیتا ہے۔

اگر ہم پچھلے ساٹھ سال کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں تو حقوق انسانی کی تقریباً تمام کی تمام خلاف ورزیاں یا تو انہیں پانچ ممالک نے کی ہیں یا ان کی حمایت سے دوسروں نے کی ہیں۔ یہاں اصل مسئلہ یہ ہے کہ کوئی ایسا نظام ہے ہی نہیں جس کے تحت بڑی طاقتوں سے ان کی خلاف ورزیوں پر کوئی جرح کی جاسکے۔ اور پھر ویٹو کا حق تو اقوام متحدہ کے ہر چارٹر کو لایعنی بنا کر رکھ دیتا ہے جو کہ ان 30 آرٹیکل کے ہی خلاف ہے۔

آرٹیکل 16 کے مطابق "خاندان انسانوں کی ایک بنیادی اور فطری اکائی ہے اور یہ حکومت اور معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ اس کی حفاظت کرے"[29]۔ لیکن اس انسانی حقوق کے علمبردار کو اس بات سے کوئی لینا دینا نہیں ہے کہ اکثر ممالک شادی کے قانون کو اتنا مشکل بنا دیتے ہیں کہ معاشرے کے اکثر اراکین شادی نہ کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ یہ آزادی کے نام پر آزاد جنسی تعلق کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو کہ شادی کا ایک متبادل بننے کی وجہ سے خاندانی نظام کو ہی تباہ کر دیتا ہے۔

آرٹیکل 29 کے مطابق "ان حقوق کا استعمال کسی ایسے موقعے پر نہیں کیا جاسکتا جس سے کسی دوسرے آرٹیکل کی خلاف ورزی ہو رہی ہو"[30]۔ اسی آرٹیکل کے مطابق "ان حقوق کا استعمال اقوام متحدہ کے مقاصد اور نظریات کے خلاف بھی نہیں کیا جا سکتا"۔ یہ گویا بالکل صریح اعتراف ہے کہ یہ متضاد باتوں کا مجموعہ ہے اور ایسا کوئی ڈیکلیریشن ممکن نہیں جو سب کے لئے قابل قبول ہو۔ اب بھلا اسلام سے ان حقوق کا مطالبہ کرنا اور مسلم امت کا اس سلسلے میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

سیکولرازم

مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ دین و مذہب کو انسانوں کے اجتماعی نظام جیسے سیاست، معیشت اور کسی حد تک معاشرے سے خارج کر دینا سیکولرزم کہلاتا ہے۔ اول تو مغرب کا سیکولرزم کا دعوی خود ایک فریب ہے۔ اس نظریے کو ایک مکمل نظریے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جبکہ مغرب کے ہر ملک میں یہ نظریہ صرف جزوی طور پر ہی پایا جاتا ہے۔ کئی ممالک کے قوانین کے مطابق یہ ضروری ہے کہ مملکت کا سربراہ مسیحی ہو۔ اسی طرح کئی ممالک میں عدالت میں گواہی دینے سے پہلی بائبل پر ہاتھ رکھ کر سچائی کا عہد کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ گویا اسلام سے بھی سیکولزم کا مطالبہ نہیں کیا جاتا بلکہ یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ تم بھی اتنے سیکولر بنو جتنے ہم ہیں۔ آسان الفاظ میں اندھی تقلید کا مطالبہ، یہ دیکھے بغیر کہ عالم اسلام مغرب سے مختلف اپنا ایک تاریخی سیاق رکھتا ہے۔ اگرچہ سیکولرزم کا وجود مسیحیت کی ایک کھلی شکست ہے لیکن ایک اعتبار سے مسیحیت کے اپنے عقائد میں سیکولرزم کی گنجائش ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ عقیدہ کتنا غیر منطقی ہے عیسائیت میں بہر حال کچھ نہ کچھ سیکولرزم کی گنجائش نکل ہی آتی ہے جبکہ اسلام اور یہودیت میں معاملہ اس کے الٹ ہے۔ کہ یہاں پر اللہ کا قانون ہی خصوصی لطف و عنایت کے مظاہر ہیں۔

یہاں پر ہم سیکولرزم کے صحیح اور مفید ہونے پر بحث ہی نہیں کر رہے ہیں کہ اس طرح کی بحث تب تک فائدہ مند نہیں ہو سکتی جب تک مغرب اس فریب سے نہیں نکلتا کہ اس کے اپنے معیارات دوسروں کے لئے حجت نہیں ہے۔ بلکہ یہ معیارات جو ان کے یہاں بھلے کتنے ہی اہم ہوں ہمارے نزدیک موسمی خودرو جھاڑیوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اسلام بحیثیت دین کئی پہلو رکھتا ہے اور

اس کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ یہ اپنے ماننے والوں کی ایک امّت بناتا ہے اور تمام ماننے والوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیتا ہے۔یعنی اسلام صرف ایک نظریہ ہی پیش نہیں کرتا بلکہ اجتماعیت کی بنیاد بھی فراہم کرتا ہے۔اپنے ماننے والوں سے اپنی علاقائی شناخت کو ترک کرنے کا بھی کوئی مطالبہ نہیں کرتا۔لیکن ایسی کسی بھی وابستگی میں تنازع کی صورت میں اسلام کو ہی آخری اور قطعی حجت قرار دیتا ہے۔انسانی اجتماعی ضرورت کے لئے مغرب کے پاس جو حل ہے وہ نظریہ قومیت ہے۔"قوم" کی تعریف انتہائی پیچیدہ ہے اور کوئی بھی تعریف مکمل طور پر دنیا کی ہر قوم پر ٹھیک ٹھیک نہیں بیٹھتی۔دنیا کی تمام اجتماعیت اپنے علاقوں،اقدار،طرز زندگی،زبان اور شناخت کے ساتھ وابستگی محسوس کرتی ہے اور کسی حد تک اپنی ان بنیادوں کے معاملے میں تعصب برتتی ہی۔مغرب اسی وابستگی اور تعصب کو قومیت قرار دیتا ہے جو کہ کسی بھی چیز کو حق اور باطل قرار دینے میں حکم کا درجہ رکھتی ہے۔اسی بنا پر جرمن، کوریا، جاپان، روس، فرانس وغیرہ قومیں قرار پائیں۔لیکن کچھ قوموں کو قومیں قرار دینا انتہائی مشکل اور پیچیدہ معاملہ ہے۔مثلاً ہندوستان، ریاست ہائے متحدہ امریکہ، اسرائیل، پاکستان وغیرہ کو قومیں قرار دینا صرف الفاظ کا کھیل ہی ہو سکتا ہے۔پاکستان کس طرح سیکولر معنوں میں ایک قوم بن سکتا ہے؟ پاکستانی قومیت نام کی اگر کوئی چیز ہے بھی تو اس کی جڑیں اسلام کے علاوہ کہیں بھی نہیں پائی جاسکتیں۔

تقابلی جائزہ:

اسلام جو تصور حیات دیتا ہے اور مغربی تہذیب جس تصور حیات کی نمائندگی کرتی ہے، ان میں کون سی چیزیں مشترک ہیں اور کہاں پر شدید اختلاف پایا جاتا ہے، یا یہ کہ کن مقامات پر مفاہمت کی شکل کا امکان ہے اور کہاں پر کوئی تعاون نہیں کیا جا سکتا۔جب تک ان حدود کا تعین نہ کر لیا جائے اس وقت تک باہم مکالمہ اور اس کا تذکرہ ایک نمائش سے زیادہ نہ ہو گا، کیونکہ کسی بھی سنجیدہ اور مخلصانہ کوشش کے لیے ضروری ہے کہ قواعد عمل اور موضوعات کا تعین کرتے ہوئے گفتگو کو انہی نکات تک محدود رکھا جائے۔ چنانچہ میں یہاں پر مختصراً اس کو بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

مغربی تصور حیات تین بنیادوں پر قائم ہے:

1. سب سے پہلے تو یہ کہ انسان کی معاشی ضروریات اس کی تمام مساعی کا محرک اور کامیابی کا پیمانہ ہیں، چنانچہ مادیت اور مادی ترقی ہی زندگی کا اولین مقصد ہے۔
2. اور پھر دوسرے نمبر پر یہ کہ زندگی گزارنے کے لیے خوشی اور لذات کا حصول انسان کی تمام تر توجہات کا مرکز ہونا چاہیے، چنانچہ لذیذ قسم کے کھانے، تفریحی سفر، شام کے اوقات میں ثقافت وغیرہ کے نام پر لذت و خوشی کے حصول کے لیے موسیقی، ڈرامہ اور ٹاک شوز، فیشن شوز وغیرہ میں شرکت ایک بنیادی داعیہ اور ضرورت ہے۔
3. اور تیسرے یہ کہ "مذہب" ایک شخص کا ذاتی معاملہ ہے اس لیے مذہب کو زندگی کے دیگر معاملات میں داخل اندازی سے روکا جائے اور کائنات اور انسانی معاشرہ، دونوں کو کسی الٰہی ہدایت کا پابند نہ بنایا جائے کہ انسان فقط اپنی ذاتی رائے اور قوت فیصلہ سے ہی اپنے تمام معاملات طے کرے اور اخلاق اور مذہب تو ایک اضافی چیز ہے، ہاں انفرادیت (Individualism) یا ہر فرد کی مکمل آزادی کہ وہ جو چاہے کرتا رہے، یہی مغربی تہذیب کی پہچان ہے۔

تصور حیات کی سطح پر تو اسلام ان ساری تہذیبوں سے اختلاف کرتا ہے جو چاہے مغرب میں ہوں یا مشرق میں اگر ان کی بنیاد

اوپر تحریر کردہ تثلیث ہو۔ جبکہ اسلام انسان کو ایک اخلاقی مخلوق قرار دیتے ہوئے زندگی کے تمام معاملات کو عالمگیر اخلاقی اصولوں کے مطابق کرنے کی تعلیم دیتا ہے، کہ مثلاً اگر جھوٹ بولنا اور عدل نہ کرنا انفرادی سطح پر غلط ہے تو معاشرتی اور ملکی اور عالمگیر سطح پر بھی ناقابل قبول ہے۔ یہ تو ناہی وقت کے ساتھ تبدیل ہوتا ہے اور نہ فرد کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنی صوابدید اور عقل کے مطابق سچ اور عدل کی تعریف کرلے۔ اسلامی تہذیب کی بنیاد ایک ایسے خالق کے وجود پر نہیں ہے جو کائنات بنانے کے بعد کسی گوشہ میں آرام کر رہا ہو بلکہ وہ حی و قیوم (زندہ جاوید ہستی) اور عزیز و علیم (صاحبِ اقتدار و صاحبِ علم ہستی) ہونے کی بنا پر ہر لحہ اپنی مخلوق کی نگرانی اور بھلائی میں مصروفِ عمل ہے۔ وہ انسان کو اس کی حاجات و ضروریات کے پیش نظر ہدایت سے نوازتا ہے اور وقتاً فوقتاً الہامی ہدایت کی شکل میں عالمگیر اخلاقی ضابطہ اور قانون دیتا ہے تاکہ معاشرہ میں عدل واخوت و رواداری قائم ہو اور لوگوں کے حقوق پر ڈاکے نہ ڈالے جاسکیں۔ وہ اپنے بندوں کو مال، صحت اور وسائل وغیرہ دیتا ہے تاکہ وہ دنیا میں اس کے نمائندہ اور خلیفہ ہونے کی حیثیت میں ان وسائل کو انسانیت کی فلاح کے لیے امانت کے احساس کے ساتھ توازن واعتدال سے استعمال میں لائیں۔ اسلامی نظریہ حیات اس دنیا کو ایک تجربہ گاہ قرار دیتے ہوئے انسان کی محدود زندگی کا مقصد تعمیری، اصلاحی اور اخلاقی طرز عمل سے ایک طرف مثالی عادلانہ معاشرہ قائم کرنا قرار دیتا ہے جس میں ایک جانب تو انسان خوشی، لذت اور اطمینان پاتا ہے اور دوسری طرف اس دنیا میں اخلاق والا طرز عمل اختیار کرنے کے نتیجے میں وہ آنے والی ابدی اور ہمیشہ کی زندگی میں انسان سے بہترین اجر اور انعامات سے نوازنے کا حقیقی اور سچا وعدہ فرماتا ہے۔

اس حیثیت سے دیکھا جائے تو تصور حیات میں اختلاف کے باوجود ایسے اُمور میں جہاں انسانوں کا مجموعی مفاد ہو اسلام اور وہ تہذیبیں جو لذت، دولت اور فرد کی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں انتہائی محدود اور مخصوص صورتوں ہی میں تعاون علی البرّ کر سکتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام سے وابستہ افراد کے ذمہ یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے تصور حیات کی وضاحت اور تعارف کے لیے دیگر تہذیبوں کے ساتھ تبادلۂ خیالات اور مکالمہ کا مناسب استعمال کریں تاکہ حق، عدل، اخوت اور عالمی انسانی برادری کے عالمگیر اصولوں پر تعاون کی فضا پیدا ہو سکے۔

اسلام اور مغرب کے مکالمہ کی ایک اور سطح ان بنیادی اقدار کو دوبارہ متعارف کرانے کا عمل بھی ہے جو کچھ عرصہ قبل خود مغرب میں بھی قابل احترام سمجھی جاتی تھیں لیکن مادیت، انفرادیت اور لذتیت کی تثلیث پر ایمان و عمل نے ان اقدار کو متزلزل کر دیا ہے۔ ان اقدار میں نظام خاندان کا احیاء اور اسلامی خاندان کے تصور کا مغرب کے سامنے پیش کیا جانا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مغربی تہذیب ہی نہیں کسی بھی تہذیب کی بقاء اور احیاء اس کی آنے والی نسلوں پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر آنے والی نسلوں کو اخلاقی اقدار سے روشناس نہ کرایا جائے، ان کی تربیت گھر اور تعلیم گاہ میں نہ ہو، انہیں قربانی، ایثار، حق گوئی، عدل رواداری کی صفات گھر کے ماحول اور تعلیم گاہ میں نظر نہ آئیں تو اس تہذیب کا زوال یقینی ہو جاتا ہے۔ مغرب اور اس کی نقالی میں بہت سی دیگر اقوام نے خاندان کے ادارہ کے تقدس کو پامال کرتے ہوئے شادی دیر سے کرنے اور تنہا رہنے کے تصور کو اور ''انسانی حقوق'' کے نام پر حیوانی حقوق سے بھی کم تر اس تصور کو سیاسی نعرے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے یک جنسی شادی کے تصور کو یورپ اور امریکہ میں قانونی تحفظ فراہم کر کے انسانی تہذیب کی مکمل طور پر تباہی کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ روم اور یونان اپنے فلسفہ اور ادب کی ترقی کے باوجود اپنی اخلاقی بے راہ روی اور

خاندان کے نظام کے تباہ ہونے کے بعد سنبھالا نہیں لے سکے تو مشینوں پر پلنے والی تہذیب اور ٹیکنالوجی پر فخر کرنے والی اقوام کب تک مشینی کل پرزوں کے سہارے تہذیب و ثقافت کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا دے سکیں گی۔ اس مکالمہ میں اسلام مغرب کو بہت کچھ دے سکتا ہے اور عالمی انسانیت کی بقاء اور احیاء کے لیے صحت مند اور آزمودہ اقدار فراہم کر سکتا ہے۔

خلاصۂ بحث:

اسلام میں ایثار اور ہمدردی کا جو تصور ہے وہ مغربی فکر میں ناپید ہے اسی طرح اسلام میں مساوات کا جو تصور ہے وہ تو حقیقی معنوں میں سب کے لیئے مساوی ہے لیکن مغربی فکر میں من چاہی مساوات ہے کہ طاقتور ممالک جسے مساوات گردانیں وہ تو مساوات ہے اس کے علاوہ نہیں۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس میں عبادات معاملات معاشرت سیاست معیشت الغرض زندگی کے تمام شعبوں کیلئے مکمل احکامات وضوابط ہیں اور تمام شعبے باہم مربوط ہیں جیسے عبادات پر اجر ہے ایسے ہی بقیہ تمام شعبہ زندگی کے احکمات پر بھی اجر ہے عبادات سے باقی شعبوں میں خیر غالب آتی ہے اور باقی شعبوں میں احکامات پورے کرے تو عبادات کامل اور مقبولیت کا کامل اور مقبولیت کا درجہ پاتی ہیں، اور اس طرح سے ہر شعبہ زندگی میں خیر ہی خیر کا راج ہوتا ہے جو ہر انسان چاہتا ہے، جبکہ مغربی فکر انسانی جذبات کو اور خواہشات کو اعلی پیمانے پر پورا کرنا چاہتی ہے، یہ ایک خیالی پلاؤ سے زیادہ کچھ نہیں کیونکہ انسانی جذبات اور خواہشات باہم ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغربی فکر اکثر انسانوں کی خواہشات کو پورا کرتی ہے اور باقی کی خواہشات کو قربان ہونا پڑتا ہے لیکن حقیقت اتنی بھی نہیں جمہوری حکومت بہت مثالی بھی ہو تب بھی 51 فیصد ووٹ والی ہو گی یعنی 49 فیصد کو قربانی دینا ہو گی ورنہ عموما 25 فیصد والی جمہوری حکومت بھی بن سکتی ہے مزید برآں یہ کہ جمہوری حکومت بھی اختیارات حاصل کر لینے کے بعد عوامی جذبات کا خیال رکھے اس کا بھی کوئی معقول انتظام نہیں اس لیے موجودہ جمہوری نظام چند مالدار بااثر سرمایہ دار افراد اور چند قبائل کے پاس ہے یا ان کے اشاروں پر چلنے والوں کے پاس ہے۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

حوالہ جات(References)

[1] بزدار، عبد القادر، محمد انس، اسلام اور مغرب: ڈاکٹر محمود احمد غازی کے افکار کا خصوصی مطالعہ، الایضاح، جلد:۲۸، شمارہ: ۱، ۲۰۱۴ء

Buzdār, ʻAbd al Qādir, Muḥammad Anas, "Islām or Maghrib: Dr. Mehmood Aḥmad Ghāzī k Afkār ka Khaṣūṣī Muṭāla'ah", *Al ʻĪḍāḥ, Vol.: 28, Issue: 1 (2014)*

[2] خان، دوست محمد، اسلام اور مغرب کے باہمی اختلافات، الایضاح، جلد:۳۳، شمارہ:۱، ۲۰۱۶ء

Khan, Dost Muḥammad, "Islām or Maghrib k Bāhamī Ikhtalāfāt", *Al ʻĪḍāḥ, Vol.: 33, Issue: 2 (2016)*

[3] سورۃ الحجرات، ۱۳

Sūrah Al Ḥujarāt, 13

[4] سورۃ النساء، ۱

Sūrah Al Nisā’, 1

[5] احمد بن حنبل، مسند احمد، مؤسسۃ قرطبہ، قاہرہ، حدیث نمبر: ۲۳۵۳

Aḥmad bin Muhammad, *Al Musnad*, (Cairo: Mo’asasah Qurṭubah), Ḥadīth # 2353

[6] العتکی، احمد بن عمرو، مسند البزار، مکتبہ العلوم والحکم، المدینۃ المنورۃ، حدیث نمبر: ۸۵۲۶

Al ‘Atakī, Aḥmad bin ‘Amar, *Musnad Al-Bazzar*, (Madina: Maktabah Al ‘Ulūm wal Ḥikam), Ḥadīth # 8526

[7] البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، دار طوق النجاۃ، بیروت، طبع اول، ۱۴۲۲ھ، حدیث نمبر: ۱۳

Al Bukhārī, Muhammad bin Ismā‘īl, Ṣaḥīḥ Al Bukhārī, Ḥadīth # (Beirut: Dar Ṭawq Al Najah, 1st Edition, 1422), Ḥadīth # 13

[8] سورۃ الحجرات، ۱۱، ۱۲

Sūrah Al Ḥujarāt, 11, 12

[9] سورۃ القصص، ۷۷

Sūrah Al Qaṣaṣ, 77

[10] سورۃ المائدہ، ۲

Sūrah Al Mā’idah, 2

[11] الترمذی، سنن الترمذی، دار الغرب الاسلامی، بیروت، ۱۹۹۸ء، حدیث نمبر: ۲۶۲۷۔ النسائی، السنن الصغری، مکتب المطبوعات الاسلامیہ بحلب، طبع ثانی، ۱۹۸۶ء، حدیث نمبر: ۴۹۹۶

Al Tirmidhī, Muhammad bin ‘Eisa, *Al Sunan*, (Beirut: Dar Al Gharab al Islāmī, 1998), Ḥadīth # 2627. Al Nasā‘ī, *Al Sunan al Sughra*, (Aleppo: Maktab al Maṭbū‘āt al Islāmiyyah, 2nd Edition, 1986), Ḥadīth # 4996

[12] الترمذی، سنن الترمذی، باب ماجاء فی اللعنۃ، حدیث نمبر: ۱۹۷۷

Al Tirmidhī, Muhammad bin ‘Eisa, *Al Sunan*, Ḥadīth # 1977

[13] مسلم بن الحجاج، صحیح مسلم، داراحیاء التراث العربی، بیروت، باب بیان أن الدین النصیحہ، حدیث نمبر: ۵۵

Muslim, *Ṣaḥīḥ Muslim*, (Beirut: Dār Iḥyā’ al Turath al ‘Arabī), Ḥadīth # 55

[14] سورۃ آل عمران، ۱۱۰

Sūrah Āal ‘Imrān, 110

[15] سورۃ آل عمران، ۱۰۴

Sūrah Āal ‘Imrān, 104

[16] الترمذی، سنن الترمذی، باب ماجاء فی اللعنۃ، حدیث نمبر: ۲۱۶۹

Al Tirmidhī, Muhammad bin ‘Eisa, *Al Sunan*, Ḥadīth # 2169

[17] سورۃ المائدۃ، ۲

Sūrah Al Mā‘idah, 2

[18] سورۃ التوبۃ، ۷۱

Sūrah Al Tawbah, 71

[19] سورۃ التوبۃ، ۶۷

Sūrah Al Tawbah, 67

[20]سورۃ النساء، ۱۴۵

Sūrah Al Nisā', 145

[21]سورۃ الجاثیۃ، ۱۵

Sūrah Al Jāthiyah, 15

[22]سورۃ النجم، ۳۹

Sūrah Al Najam, 39

[23]سورۃ الزخرف، ۳۲

Sūrah Al Zukhruf, 32

[24]سورۃ الماعون، ۱، ۲

Sūrah Al Mā'ūn, 1, 2

[25]سورۃ البقرۃ، ۲۲۰

Sūrah Al Baqarah, 220

[26] *The Universal Declaration of Human Rights*, (New York: United Nations Information Center), Article 19. www.ohchr.org

[27] عادل فراز، مغرب میں آزادیٔ اظہار کا تصور اور اسلام، نقطہ نظر، مضامین، اشاعت ۲ نومبر ۲۰۱۷ء

Adil faraz, "The Concept of Freedom of Expression and Islam in the West", *Nuqṭa-e-Naẓar, Mazamin, 2nd Issue, November 2017.* www.mazameen.com

[28] *The Universal Declaration of Human Rights*, (New York: United Nations Information Center). www.ohchr.org

[29] Ibid., Article 16.

[30] Ibid., Article 29.